اللّٰہُ جمیلٌ یُحِبُّ الجمال

جمالِ یار

جو

سند المحققین، حضرت محمد جمال الدین نوری حیدرآبادی پروفیسر عربی نظام کالج مدظلہم العالی

اور

عالیجناب، گردوں قباب، قمر رکاب، نواب مستطاب ہز ایکسلنسی، راجۂ راجایاں، مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر، یمین السلطنۃ جی، سی، آئی، ای شاد پیشکار و سابق وزیر اعظم دولت آصفیہ بالقابہم کی ایک پُر کیف مراسلت کا مختصر مجموعہ ہے۔

مطبوعہ
(سنہ ۱۳۴۱ھ)
شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن
(حقوق محفوظ)

سرنامہ

میں بڑی مسرت کے ساتھ اظہار کرتا ہوں کہ اس دلچسپ و نادر تحفہ کے

طبع کی سعادت مجھے حاصل ہوئی زمانے کی ناقدری کے باعث بعض ذی کمال و

صاحب فضل و ہنر پبلک کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے اور اسی بے حسی کے سبب

ان کے کمال و ہنر و فضل سے قوم و ملک کماحقہ استفادہ حاصل کرنے سے محروم

رہ جاتے ہیں ہمارے واجب التعظیم بزرگ سید شاہ ظہور عالم حسینی سجادہ نشین و

خلف صدق رہنمائے طریقت حضرت سید افتخار علی شاہ صاحب وطن حیدرآبادی

رحمۃ اللہ علیہ کا ممنون ہونا چاہئے کہ بزرگ ممدوح کی بدولت یہ دولت ہاتھ آئی

کیونکہ اس پُر اسرار و معرفت مراسلت کی وجہ آپ ہی کی ذات ستودہ صفات

ہوئی ہے اور جب رفتہ رفتہ علمائے کرام، مشائخ عظام کے باخبر حلقوں سے اس

کی اشاعت پر اصرار ہونے لگے تو بالآخر خاکسار نے استاذ الاساتذہ علامہ محمد جمال الدین

صاحب نوری حیدرآبادی پروفیسر عربی نظام کالج مدظلہم العالی سے طبع کی

اجازت حاصل کر لی اور ملک کے مشہور اہل قلم منشی فاضل، مولوی فاضل ملا

محمد عبدالباسط صاحب (مصنف تعلقہ اُکھتم) خلف فخر قوم جامع العلوم، ملّا
محمد عبدالقیوم صاحب مرحوم سے "دیباچہ" لکھوایا پھر عالیجناب نواب مستطاب
ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی، سی، آئی، ای شاد
بالقابہم کی خدمت بابرکت میں اس مجموعہ کا نام تجویز فرمانے کی گزارش کی تھی
مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر بجمیع القابہم نے ؔ ؔدو نام تجویز فرماکر یہ نوازش نامہ رسال
فرمایا ہے:-

"مہربان ابو محمد عمر بن صلاح ضایافعی صاحب" السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ ۲۶ بہمن ۱۳۲۲ف مع جمال دوست کی نظرفروز تصویر کے جو
کتاب کی صورت میں ہے وصول، فقیر شاد یادآوری سے شاد کام ہوا

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

مولانا کا دوسرا فلسفیانہ خط جب فقیر کو ملا ہے تو

صد بار ز بیتابی وا کردم و پیچیدم

کئی روز تک تو اُس کے لطیف مضامین سے لذت یاب ہوتا رہا، جواب لکھنے کا

ارادہ کیا مگر کثرت کار و ہجوم افکار سے ارادہ کر کے بھول گیا یہاں تک کہ دو برس کے بعد۔ آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

جو کتاب اس وقت میرے سامنے ہے اس میں صرف تین خط ہیں۔ دو خط مولانا کے اور ایک مختصر خط فقیر کا۔ مولانا کے دوسرے خط کا جواب میرے ذہن سے نکل گیا پہلے خط کا مختصر جواب بھی اس قابل نہ تھا کہ پبلک میں لایا جاتا۔

مولانا کو حقیقت تو یہ ہے کہ عرفانی حلقۂ ادب میں صدر نشینی کا حق حاصل ہے ان کے طبعی جوہر اور فطرتی کمال کی جیتی جاگتی تصویریں بزم جمال ادب کی زیبایش کا وہ سامان مہیا کر رہی ہیں جن کے محاسن کا اندازہ کرنا محال عقل ہے۔ بقاصد حیات کی تکمیل ابتدائی آفرینش سے باہمی الفت و محبت کی بدولت جاری ہے جس طرح نگار خانہ قدرت کے سجانے والے نے آب و گل اور رنگ و بو کے اجتماع سے گل پیدا کر دئے ہیں اور گلوں کی فراوانی سے گلشن آراستہ کر دیا ہے سورج چمکتا ہے تو عالم بقعہ نور بن جاتا ہے۔ بادل برستا ہے تو زرع و نخیل کو شادابی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا نوری کے برکات و فیوضات پر دنیائے ادب ناز

کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مولانا کا وجود مغتنمات سے ہے۔ کتاب کے نام کے
متعلق جو آپ نے ایما کیا ہے کیا آپ سے بہتر میں اس کے نام کا انتخاب کر سکتا
ہوں، اللہ جمیل یحب الجمال۔ اہل نظر تو جمال نوری کی تحریر کو تصویر
جمال نور خیال کر کے دل کے البم میں جگہ دیں گے۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی
(جمال نور) تتمہ انوار کمالیہ ہے جب حضرت موسیٰ (جمال یار) کے دیکھنے
کی تاب نہ لائے تو اور کسی کا حوصلہ ہے کہ اس تصویر کے دیکھنے کی تاب لا سکے:
الغرض ان دو قوسین کے الفاظ صوری و معنیٔ معنوی کے اعتبار پسند آئیں تو
ان میں سے حسب ایمائے مولانا جو مناسب سمجھیں رکھیں۔ بلکہ سب سے زیادہ بہتر
یہ ہوگا کہ مولانا ہی اس کی بھی تکمیل کریں۔" فقیر دیشاہ (یمین السلطنت)
"جمال نور اور جمال یار" یہ دونوں نام اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے بڑے پر لطف و
معنٰے خیز ہیں "جمال یار" میں حضرت موسیٰ بنّیا علیہ السّلام کی امتیاز خصوصی نے جو جلوہ
پیدا کر دیا ہے، وہ ارباب نظر کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتا، اس لیے اسی نام
(جمال یار) سے عنوان کو زینت دی جاتی ہے۔

بندۂ عاصی
ابو محمد عمر بن صلاح "یافعی"
(حیدر آبادی)

دیباچہ

از

منشی فاضل مولوی فاضل ملا محمد عبدالباسط صاحب

یہ مجموعہ حضرت اُستاذی مولانا مولوی محمد جمال الدین صاحب نوری مدظلہم پروفیسر عربی نظام کالج اور
مہاراجہ سر یمین السلطنت المتخلص بہ شاد بجمیع القابہم کی مراسلت کا ایک مختصر نمونہ ہے جس میں منطق فلسفہ
و تصوف کے بہت سے نکتے حل کیے گئے ہیں اگرچہ اس کی ابتدا محض ایک شخصی سفارش سے ہوئی ہے لیکن
بمصداق "اَلحکَایتُ ذُو شُجُوْن" اس میں معارف و حقائق کے بہت سے مسئلے اس خوبی اور
بیساختگی کے ساتھ معرض تحریر میں آگئے ہیں کہ ارباب علم و فضل اور اصحاب ذوق و شوق کے لیے ایک یہ
دلچسپ و دلکش تحفہ سمجھا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا دقیق علمی مسائل کو صاف و دلاویز پیرایہ میں بیان کرنے کا خداداد سلیقہ رکھتے ہیں نہ صرف
تحریر بلکہ آپ کی تقریر بھی نہایت واضح صاف مسلسل اور دلچسپ ہوتی ہے اور سامعین کے دل بول اٹھتے ہیں کہ

"دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

اگرچہ ان خطوط کی عبارت شان انشاپردازی لیے ہوئے ہے لیکن سلاست اور روانی اور بیساختگی

اور برجستگی کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ طرز خاص مع لائے ممدوح
کی طبع وقاد کی ایجاد ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

مہاراجہ بہادر بالقابہم کے جو احسانات ادب اردو پر ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں
آپ نے ارباب فضل و کمال کی جیسی کچھ سرپرستی اور قدردانی فرمائی وہ کسی شخص سے مخفی نہیں اس
مختصر رسالہ کے دیکھنے سے بھی آپ کی دریا دلی و علم دوستی اور معارف پروری کا کافی ثبوت ملتا ہے
اور ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد زمانہ سلف کے مشاہیر جعفر برمکی، صاحب بن عباد اور عبدالرحیم
خانخاناں کی علمی فیاضیوں اور معارف پرستیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
جناب ممدوح نہ صرف ذوق شعر و سخن رکھتے ہیں بلکہ فضل و کمال کی سرپرستی اور قدردانی میں بھی
فی زماننا اپنا نظیر و ہمسر نہیں رکھتے۔

ہمارے مکرم دوست مولوی ابو محمد عمر بن صلاح صاحب "یافعی" کی علمی دلچسپی نے اس دلکش
تحفہ کو زیور طبع سے آراستہ کر کے پبلک کے سامنے روشناس کیا۔ امید ہے کہ پبلک اس کو عالیجناب
مہاراجہ بہادر کی علمی قدردانی اور ہنر پروری اور حضرت مولانا کے تبحر علمی اور کمال انشا پردازی
کی یادگار سمجھ کر دلچسپی کی نظروں سے دیکھے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَا اَنْتَ بِالسَّبَبِ الضَّعِیْفِ وَاِنَّمَا	نُجْحُ الْاُمُوْرِ بِقُوَّۃِ الْاَسْبَابِ
فَالْیَوْمَ حَاجَتُنَا اِلَیْکَ وَاِنَّمَا	یُدْعَی الطَّبِیْبُ لِسَاعَۃِ الْاَوْصَابِ

کہف الغربا! محب الفقرا!!

حکمت کا نور اور قدرت کا ظہور جب آئینۂ خود نمائی ہو کر کارسازی کے جوہر دکھاتا ہے تو چکا چوند سی لگ جاتی ہے، ہوش اڑ جاتے ہیں اور عقل دنگ ہو جاتی ہے، یاس کے گھونگٹ سے امید کا چہرہ نظر آتا ہے، ظلمت سے آفتاب کی چمک پیدا ہوتی ہے اور یمن سے نفس[1] رب کی مہک لیکن کرشمۂ قدرت کی نقشبندی کسی خصوصیت کے رنگ میں ڈوب کر صرف نیم رُخ تصویر کا عالم نیرنگ

---

[1] حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے (حدیث: اِنِّی لَاَجِدُ نَفَسَ رَبِّکُمْ مِنْ نَاحِیَۃِ الْیَمَنِ ۱۲)

نہیں دکھاتی ہر رنگ میں بے رنگی کا روپ لیکر آنکھوں میں بیٹھ جاتی ہے
اور ہر روپ میں آنکھوں کی راہ دل میں اُتر جاتی ہے یہاں اسباب
رخِ روشن کے لیے نقاب ہیں اور چشمِ سیاہ کے لیے حجاب۔ اس لیے
کہیں نقاب منہ پر ڈالکر دور سے رخسار کی جھلک دکھاتی ہے کہیں
نقاب اُلٹ کر جلوہ گر ہو جاتی ہے اور بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہے
اسوقت عارض پرنور کی شعاعوں میں آتش طور کا عالم نظر آتا ہے اور
تمام اسباب جل کر خاکِ سیاہ ہو جاتے ہیں پہلی صورت ہو تو سبب سازی ہے
دوسری صورت ہو تو سبب سوزی۔

لوذعی خاکسار کا حال صاف کہتا ہے کہ اسیر ہستی ہوں اور
گرفتارِ خود پرستی۔ اس لئے سبب سوزی کی نسبت اگر کچھ کہتا ہوں تو
چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ وہی سرفروش یہاں سُرخرو ہو کر نکلتے ہیں
جو خدا پرستی کے میدان میں تلوار سونت کر کود پڑتے ہیں اور جان دیکر
فتحیاب ہوتے ہیں۔ اس مقام پر خالی بکواس فلسفیانہ خیال بازی ہے

یا شاعرانہ بلند پروازی سے

زباں آوراں را بہ تو بار نیست　　کہ با مشعلہ گنج را کار نیست

رسانی زباں از رقیبانِ راز　　کہ تا رازِ سلطاں نہ گویند باز

رہی سبب سازی، اِسی کی لپیٹ میں تعلقات کی گتھیاں جو
سلجھتی ہیں اور کاروبار کے دشوار پیچ آسانی سے کھلتے ہیں کہ دنیا
عالم اسباب ہے اور سرائے تعلق یہاں ضرور ہیں زندگی بھر پیچھا نہیں
چھوڑتیں۔ تعلقات کی سلسلہ بندی زنجیرِ پا ہوتی ہے اور اسباب کی
رسیاں پھانسی کا پھندا ہو کر گلے میں پڑ جاتی ہیں کہ جب تک دم نہیں
نکلتا چھٹکارا نہیں ہوتا۔ لیکن اسباب کی قوت اور جوانمردوں کی مروت
اقبال کا نشان ہے اور فتح کا پھریرا، اس لیے جب یہی پھندا نہایت
مضبوط پڑتا ہے اور کسی زبردست امیر کا قوی ہاتھ رسی کھینچ کر زورِ بازو
دکھاتا ہے تو خدا کی شان کہ بیجان قالب میں جان پڑتی ہے اور دم میں
دم آتا ہے ورنہ جان پر بن جاتی ہے اور دم گھٹ کر خاتمہ ہوتا ہے اسی لیے

شاعر نے کہا ہے ؎ ع

نُجحُ الاُمُورِ بِقُوَّۃِ الاَسبَابِ

اس میں شک نہیں کہ دیس میں پردیسی ہوں اور اُٹھٹپیل رہ کر اجنبی کہ جان ہے نہ پہچان اور اگر ایک آدھ ملاقات ہو بھی گئی ہے تو اُس کا وزن حُسنِ اتفاق سے زیادہ نہیں ہو سکتا، اس لیے نارسائی کا پلہ اتنا بھاری نظر آتا ہے کہ رسائی کا ذکر اگر چھیڑتا ہوں تو خفت کا سامنا ہوتا ہے اور نگاہ نیچی ہو جاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ آسمانِ امارت کی بلندی اور زمینِ احتیاج کی پستی پر جب نظر پڑتی ہے تو پسینہ آجاتا ہے، نقیبِ ادب گستاخی کا الزام دے کر بے تمیزی کی فہرست میں نام لکھتا ہے اور صدائے دورباش بلند ہو کر دورباش کی شان دکھاتی ہے، لیکن اس پر بھی جی نہیں چھوٹتا، دل نہیں ٹوٹتا اور مایوسی نہیں چھاتی خوب جانتا ہوں کہ صاحبانِ کرم کی ہمتِ ذاتی جویائے سائل ہوتی ہے اور

ہمتِ ذاتی بہ جود دست از گدا محتاج تر
از کریماں خواستن احساں بسائل کرد نست

اس لیے سفارش کی جرأت ہوتی ہے اور گزارش کی ہمت۔

حضرت سید افتخار علی شاہ صاحب قبلہ کا نام شہرت کے آسمان پر آفتاب ہو کر چمک رہا ہے۔ اُمرائے دولت اُن سے ناواقف نہیں ہیں اور فقرائے شہر نا آشنا نہیں، سجادہ نشینِ چشتی چمن سید ظہور عالم حسینی اُن کے فرزند ہیں۔ اور میرے سببی بھائی، جب حضرت مرحوم کا انتقال ہو گیا تو مظلوم سید نے توکل کے سوا کوئی اور میراث نہیں پائی نصیبے کی کھوٹ تھی یا بے نصیبی کی اوٹ کہ گھچی مچوٹ کھائی اور لُٹ کر ننگے ہو گئے یومیہ ملا نہ منصب، آخر پیدل کی جوُن لے کر خالی ہاتھ پیچھے رہ گئے اور اُن کے علاتی بھائی گھوڑا مار کر آگے نکل گئے فریاد لب تک آکر بند ہو گئی اور نالہ زباں تک پہنچکر تھم گیا۔ ع

پرواز مرغ بسمل، جز زیر پر نہ باشد

اب تنگدستی کے صحرائے پُرخار نے انکی بُری گت بنائی ہے پاؤں آبلہ پا
ہو کر گھنگرؤں سے لد گئے ہیں طاقتِ رفتار طاق ہو کر حسرتِ عنقا ہو گئی ہے
اور گھنگرو بولنے کی نوبت آگئی ہے کہ اگر کسی مسیحا نفس کی معجز نمائی نہ ہو
روح پھونکنے میں ذرا بھی کمی کرتی ہے تو بے طاقتی کا زور بڑھ کر سانس
اکھڑ جاتی ہے اور بیدست و پائی کے ہاتھوں خون ہوتا ہے اس لیے
قابلِ رحم ہیں اور لائق توجہ۔

آمیر دریادل، وزیر ماہ منزل، نواب مستطاب سپہر معین السلطنت بہادر
کی دریادلی گھنگھور گھٹا ہو کر درویشان بے نوا پر زر و گہر کا مینہ برساتی ہے
فقرائے ہند جھولیاں بھر کر نہال ہو جاتے ہیں اور مشائخ طریقت
موتی رول کر مالا مال ہیں اس لیے امید بندھتی ہے کہ ان کی بے کسی
اور بے بسی پر بھی مہر کی نظر ہو جائے گی، آفتاب ہمت چمکے گا۔
ابرِ کرم برسے گا اور ماہانہ کچھ نہ کچھ ماہوار یا روزانہ کچھ نہ کچھ یومیہ مقرر
ہو کر دعا گویانِ دولت میں شمار ہو جائے گا اور بختِ خفتہ بیدار

چشمِ سیہ بنعمتِ الوانِ دہر نیست

چوں داغ لالہ سوختہ نانے مرا بس ست

اب اگر یہ کہتا ہوں کہ مجھ پر احسان ہوگا تو ایک گری سی بات ہے

اور معمولی طرزِ ادا ہیں کیا اور میری احسانمندی کیا؟ ان پر اور انکے

خاندان پر احسان ہوگا دستِ دعا بے اختیار اُٹھ جائیں گے خدا

خوش ہو جائے گا اور بات بات میں غیبی مدد ہوگی۔

اِرْحَمْ مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكَ مَنْ فِي السَّمَاء

اگر اثر کی دشمنی کوئی رنگ لائی اور نامرادی نے سفارش کا خون کیا

سمجھوں گا کہ ع

آنچہ رسم از دل بہ تاثیر فریادِ من است

لیکن جب خدائے توانا کی عنایت پر اس بندۂ ناچیز نے

نظر رکھی ہے اور بھروسا کیا ہے اسی خدائے بے ہمتا کے دریائے رحمت

سے آواز آتی ہے کہ "مایوس نہ ہونا گوہرِ مراد ہاتھ آئیگا اور سفارش

خالی نہ جائے گی"۔ عنایت ازلی جب کسی کی دستگیری کے لیئے بیڑا اٹھاتی ہے تو بے سببی خود ایک سبب کا روپ دھارتی ہے نارسائی سے رسائی کا رنگ ٹپک پڑتا ہے اور کامیابی کی دلفریب صورت اپنے حسنِ عالم سوز کی آب و تاب دکھا کر کلیجے کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور آنکھونکی بینک ع

عنایتِ ازلی را بہانہ بے سببی ست

اللہ بس باقی ہوس

خاکسار

(نوری)

محمد جمال الدین عفی عنہ

پروفیسر عربی نظام کالج

ہفتم ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۸ ہجری

۱۵ محرم الحرام ۱۳۲۹ھ
۲۲ آبان ۱۳۲۹ف

سٹی پالیس مشکاری
حیدر آباد دکن

ہوالکل یا معین

مولانا!

السلام علیکم کہوں یا رام رام کہوں، دونوں صورتوں میں بھی ع

آں گریباں گرفت و ایں دامن

کا مطلع صاف ہے۔ آپ کے ، ذی حجہ کے محبت نامہ کا جواب ۱۵ محرم کو
دے رہا ہوں، آپ ضرور سمجھتے ہوں گے کہ جس قدر امارت کی کسوت میں

صورتیں نظر آتی ہیں، بڑی متکبر اور خود غرض اور دروغ گو ہوتی ہیں، تسلیم۔ مگر شاد امیر تو نہیں ہے مگر ہاں ایک امیر کے خاندان میں پیدا ہوا ہے نشو و نما پائی ہے، اس لیے امیر پکارا جاتا ہوں، ورنہ ایک غریب مسکین ہوں، کسی کے نام پر بک چکا ہوں، خریدار کو سب خلقِ خدا جانتی ہے۔ مگر اہلِ بصیرت پہچانتے ہیں۔ آمدم بر سرِ مطلب۔

آپ کا محبت نامہ بلا مبالغہ گلدستۂ معرفت ہے بار بار پڑھتا ہوں اور اپنی استعداد کے موافق لطف اٹھاتا ہوں، اس کا جواب مجھ جیسے بے بضاعت سے ناممکن۔ وجہ تاخیر بیان کرنا اور بھی نادم ہونا ہے، اس لیے فقیر اس تاخیر کے متعلق بہتر طریقہ یہی سمجھتا ہے کہ معافی چاہتا ہوں، امید ہے کہ آپ براہِ کرم معاف فرمائیں گے۔

اور زیادہ ندامت اس کی ہے کہ آپ نے جس کیلیے سفارش کی اُن کے واسطے مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ نہ آپ کی سفارش کے لائق ہے، نہ اُن کے۔ نہ مجھ حقیر کے خاندان کی شان کے لائق ہے مگر حقیر فقیر ہے،

اِس لیے میری ذاتی شان کے لائق اگر سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پندرہ (۱۵) رُپئے ماہانہ آپ کی تحریر کی تاریخ سے اجرائی کے لیے جیب خاص کے نام حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نقل اُس حکم کی مسلک بذا ہے۔

فرض کردم کہ بیادِ تو دلم خرسند است

لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب راچہ علاج؟

زیادہ عجز و نیاز۔ آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ مولوی یعقوب علیصاحب کا جو اہلِ حدیث کے گروہ میں مشہور اور مُقدّس تھے شب میں انتقال ہوا آج صبح کے دَس بجے امانتِ الٰہی کو ان کے والد کے بازو احاطۂ نورالدّین شاہ قادری میں۔ سپرد ندیہ خاک۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

شاد نواز تھے، اِس لیے فقیر نے بھی ادائے رُسومِ تعزیت میں شریک ہو کر سعادت حاصل کی، مجھے خیال تھا کہ شاید آپ بھی وہاں ہوں گے۔ آنکھوں کی پُتلیوں نے تلاش کی مگر درشن نہیں ہوئے

کیا آپ سے ملاقات تھی؟ اور کیا آپ زیارت میں شریک ہوئے؟
سماع کی محفل میں اُس روز آپ شریک ہوتے تو زیادہ لطف آتا۔

وَالسَّلام خیر الاختتام

فقیر

یمین السلطنۃ عفی عنہ

لَقَدْ جُدْتَ حَتّٰی جُدْتَ فِیْ کُلِّ مِلَّۃٍ
وَحَتّٰی اَتَاکَ الْحَمْدُ مِنْ کُلِّ مَنْطِقٖ

کہف الغربا! غیاث الفقرا!!

حسن کی خود بینی اور عشق کی خاک نشینی آئینہ وجود کے لیے جوہر ہے اور پیشانی ظہور کے لیے جھومر حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اگر نہوتی تو وجوب و امکان کی محفل گرم نہوتی، اسی کی بدولت ناسوت کا جمال ہے اور ملکوت کا کمال عقل اول کا نور عالم قدس کی چلمن سے چھن کر دلربائی کا طلسم باندھتا ہے اور چرخ آئینہ رنگ غش ہو کر چکر میں آتا ہے شاہد گل جوبن پر آکر لال بھبوکا ہوتا ہے اور نالۂ بلبل آتش نوائی کا سماں باندھ کر سنگدلوں کے دل ہلاتا ہے شمع روشن

آگ میں جل کر حسنِ آتشیں کا زنگ نکالتی ہے اور پروانۂ ناپروا شوق کی چتا میں بیٹھ کر ایک دم میں جل بجھتا ہے، قمری کی کوکو اور پپیہے کی پی ہو حسن کی لاگ ہے اور عشق کی آگ، لیلیٰ کا چاند سا مکھڑا زلفِ شبرنگ کے پردے سے جھلکتا ہے اور مجنوں کی دشت پیمائی دن کو غبار میں تارے دکھاتی ہے، شیریں کی باتوں میں آبِ حیات کا چشمہ ابلتا ہے اور فرہاد پہاڑوں میں سر پھوڑ کر تلخیٔ موت کا مزہ چکھتا ہے، وامق و عذرا ہوں یا ہیر اور رانجھا۔ رامین و ویسہ ہوں یا جمیل اور بثینہ ہر جگہ حسن کی کشش ہے اور عشق کی کشاکش، فتح و ظفر پر شجاعت کی جان قربان ہوتی ہے اور جود و سخا پر مفلسی کا دل نثار ہوتا ہے تمنا کی لہر عشق کا شگوفہ ہے اور عشق کی بہار حسن کا کرشمہ، یہی سبب ہے کہ جہاں چشمۂ شیریں جوش مارتا ہے وہاں مرغ و مور کا ہجوم ہوتا ہے اور جہاں دریائے جود بہتا ہے وہاں تشنہ طلب آتے ہیں اور سیراب ہو کر باغ باغ ہو جاتے ہیں، دل سے دعا نکل جاتی ہے،

اور زبان سے تمنا ع

بپرد گوے سعادت کہ صرف کرد و بداد

اِس میں شک نہیں کہ آج کل زمانے کا رنگ بےرنگ ہے فقیروں کی وضع بدل گئی ہے، اور امیروں کا رُخ پھر گیا ہے، فقیروں کی داستانِ غم ایک رام کہانی ہوتی ہے اور امیروں کا دماغ راون کا کوٹ فقیروں سے قناعت سلب ہوگئی ہے اور امیروں سے کرم چھن گیا۔ اِس لیے سخاوت کا کال ہے اور شکایت کی فراوانی لیکن امیرِ عالی گوہر، وزیرِ عالی جوہر، نواب مستطاب سر یمین السلطنۃ بہادر کی دریادلی پر جب نظر جاتی ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ ابرِ کف گوہر ریز ہے اور دریا سخا جوہر خیز، اِس لیے ایک خاک نشین کی سفارش پر مہر کی نظر ہوگئی اور پندرہ روپے ماہوار جاری ہوکر سید ظہور عالم حسینی کے دن پھر گئے

ع جائے کہ ہست ذوقے میگردد آشکارا

بے شبہ خاندانِ امارت کی شان اپنی بلندی جب نظر کرتی ہے تو

کنگرۂ رفعت زبانِ حال سے کہتا ہے جو کچھ ہوا وہ آنا ہوا کہ آفتاب ہوں تو ذرہ ہے اور مہتاب ہوں تو جگنو، لیکن تقدیر کی نیرنگی یہ سنکر جواب دیتی ہے کہ مشیت پر کس کا زور چلتا ہے؟ جو منظورِ خدا تھا وہی ہوا اور جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا اور بہت اچھا ہوا۔ ع

آنچہ نصیب ست بہم میرسد

ایک نہیں کئی امیروں کو میں نے دیکھا ہے دولت کے نشے میں چور ہوتے ہیں اور حکومت پر مغرور، دل یہود کی قبر ہوتا ہے اور دماغ فرعون کا دائرۃ الخلافہ، لیکن قصرِ وزارت کا رنگ دیکھا ہوں تو کچھ اور عالم نظر آتا ہے، امیروں کے تجمل میں فقیروں کی شان ہے اور فقیروں کے رنگ میں امیروں کا ٹھاٹ، نہ دولت کا نشہ ہے نہ حکومت کا گھمنڈ، امارت کی بلندی میں تواضع کی پستی ہے سخاوت کے دریا میں خجالت کا جوش ہے اور بخشش کے نشے میں معافی کا ہوش، اس لیے قلم گوہر نگار کی نگار بندی پر جب نگاہ پڑتی ہے

تو کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت گزر جاتی ہے؟ دل تڑپ کر سینے میں لوٹتا ہے اور بیساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

من از مروّتِ طبعِ کریم فہمیدم ۔۔۔ کہ آب گشتنِ بحر این قدر ز شرمِ سخاست

عنایتِ بیحد کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا، زبان قلم ہو گئی ہے اور قلم بے زبان، لیکن بیچینی کے ہاتھوں بے اختیار ہو کر کہتا ہوں کہ مظلوم کی داد اور بیکس کی امداد عروج کا نشان ہے اور نیکنامی کا علَم، اس لیے یقین کرتا ہوں کہ خدائے مہربان اس احسان کی جزا دے کر شاد کرے گا اور عالمِ غیب سے وہ مدد ہو گی کہ مرادوں کے باغ میں بہار آئے گی، فتحیابی کے گلزار کھل جائیں گے، ستارۂ اقبال چمک کر عید کا چاند ہو جائے گا اور قیامت کا سورج، لیکن ؎

دریں منزل ز سر بازاں بناہی سازِ خاقانی
کہ بر لشکرِ جادوستان عصائے ز فن

اگرچہ حیدرآباد میرا وطن ہے۔ (بقیہ)

دِيَارٌ بِهَا حَلَّ الشَّبَابُ تَمَائِمِيْ وَاَوَّلُ اَرْضٍ مَسَّ جِلْدِيْ تُرَابُهَا

لیکن صبحِ وطن میرے لیے شامِ غربت سے کم نہیں ہے، اس لیے مُقیمانِ وطن سے نا آشنا ہوں، مولوی یعقوب علی صاحب مرحوم کو نہیں جانتا، دیسی تھے یا پردیسی، فقیہ تھے یا محدث، اچھے شخص ہوں گے خدا مغفرت کرے ؎

زندگی شبہۂ ہستی ست کہ مانندِ حباب
ہر کہ ہست آئینۂ پیشِ نفس می گیرد

نورِیؔ خاک نشیں کا حال صاف کہتا ہے کہ اسیرِ ہوس ہوں اور بندۂ ہوا، عشق کی چوٹ نہیں کھائی، حسن کا جلوہ نہیں دیکھا اس لیے سماع کی محفل میں اگر شریک ہوتا تو کیا لطف آتا ہے! ایسی محفل میں اُن ہی دل جلوں کی شرکت مزہ دیتی ہے جو بیخودی کی شراب پی کر خراب ہوتے ہیں، یکرنگی کے رنگ میں ڈوب کر بے رنگی کی بہار دکھاتے ہیں اور تفرقے کا نقش مٹا کر تیرگی میں

چشمۂ نور دیکھتے ہیں اور زشتی میں جلوۂ حور، تفصیلِ مقام یہ ہے کہ صوفیانِ عالی مقام نے توحید کی عالیشان عمارت میں چار درجے قائم کیے ہیں۔ اِن میں کوئی درجہ پست ہے اور کوئی بلند، لیکن پستی کیلیے کوئی حد ہے نہ بلندی کے لیے کچھ انتہا، کہیں پستی کا یہ نقشہ ہے کہ پتال کا تو پتا بھی ملتا ہے، مگر پستی کا تھل بیڑا نہیں ملتا، کہیں بلندی کا وہ عالم ہے کہ آسمان میں زمین کی پستی پیدا ہوتی ہے، عرشِ بریں پامال ہو جاتا ہے اور طائرِ سدرہ بے پر و بال کہ۔ ع

فروغِ تجلّی بسوزد پرم

پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان ڈانواں ڈول پھرتا ہے اور واحدِ اوّل کی یکتائی پر ایمان نہیں لاتا، زبان پھلجھڑی ہوتی ہے اور دل میں گلجھڑی۔ یہ باتوں کا جھاڑ باندھ کر توحید کے پھول بکھیرتی ہے، اور وہ شاخِ زعفران بنکر طرح طرح کے شاخسانے نکالتا ہے، اس لیے یکرنگی پر پانی پھر جاتا ہے اور دورنگی کی ہوا بندھتی ہے، زبان یہ

اقرار ہوتا ہے اور دل میں انکار۔ یہ منافقوں کی توحید ہے اور یہ توحید "دو کوڑھ میں کھاج ہے" اور آخرت میں بے سود۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل کی پھانس اور عناد کی پھانسی نکل جاتی ہے، توحید کا نقش بیٹھتا ہے اور ایمان کا رنگ جمتا ہے دورنگی کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور اعتقاد کی گرہ ریشم کی گانٹھ ہوتی ہے کہ تدبیر چلتی نہ شمشیر۔ دونوں کے ناخن گوشت سے جدا ہو جاتے ہیں اور اعتقاد کی گرہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس درجے میں دل و زبان یکرنگ ہو کر ہم رنگ ہو جاتے ہیں، ایمان کا آغاز ہوتا ہے اور نفاق کا خاتمہ اب اعتقاد مذکور میں دو[۲] مقام ہیں۔

ایک[۱] مقام یہ ہے کہ اعتبار کی نظر دلیل یا برہان پر نہیں جاتی سنی سنائی پر دل آتا ہے اور اعتقاد کی جڑ گلبنِ امید ہو کر مضبوط جم جاتی ہے، اسوقت دعوے کی حجت یا دلیل کی قوت ہاتھ میں نہیں ہوتی صرف کہی سنی اعتقاد کی دلیل ہوتی ہے اور اعتماد کی سبیل۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ دلیل یا بُرہان پر اعتبار کی نظر پڑتی ہے عقلی ثبوت زبردستی کا زور باندھتا ہے اور ایمان کا نقش پتھر کی لکیر ہو کر دل میں بیٹھ جاتا ہے، اسوقت منچلا سپاہی معرکۂ جنگ میں نہتّا نہیں رہتا ہاتھ میں تیغ بُرّاں ہوتی ہے اور پُشت پر سپر کہ جب وار بچا کر کسی پر وار کرتا ہے تو ایک پل میں حریف کا نقشہ دِگرگوں ہوتا ہے، چور نگ قلم ہو کر ہوا میں چار پر کالے ہوتے ہیں اور تحسین کے نعروں سے لڑائی کا میدان گونج اُٹھتا ہے کہ۔ ع

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند؟

پہلا مقام ہو تو عامیانہ تقلید ہے، دوسرا مقام ہو تو عالمانہ تحقیق علم ظاہر کی پرواز اسی حد تک ہے اور عقل ذُوفنون کی دوڑ اسی مسجد تک ایک دانشور یگانہ فلسفی فرزانہ ہو یا متکلم زمانہ، جب ہر پھر کر اس مقام پر آتا ہے تو پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ آگے نہ پتا چلتا نہ رستہ مِلتا، قسمت سوتی ہے اور بے بسی روتی کہ ع

در بُنِ ناخن ست نے بخت گرہ کُشائے را

اس مقام پر علم کلام کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور فلسفۂ الٰہی کا نتیجا
اِس کے بعد نہ دِرایت ہے نہ روایت بس آگے آئی آیت۔ اعتقاد کا
مقام پہلا ہو یا دوسرا اہل ایمان کا مرتبہ ہے اور توحید کا ادنیٰ درجہ
لیکن اِس کی بدولت شرکِ جلی کے جال سے رہائی ہوتی ہے دوزخ کی
آگ سے چھٹکارا ہوتا ہے اور بہشتِ بریں کی سیر نصیب ہوتی ہے کہ
مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔
نوٹ: ہمیں دل نے اس حدیث کو یہاں ظاہر پر محمول کیا ہے
ورنہ اس کے معنے شاید کچھ اور ہیں کہ قالب تصوّف کے لیے جان ہیں
اور جان کے لیے روشنی عرفان۔ ؎

فکرِ طوبیٰ و جناں در ورعِ عشق خطاست
ہرچہ در شرع مباح ست حرام ست اینجا

غرض اسی ادنیٰ درجہ میں چین سے گزر جاتی ہے اور کسی سختی کا سامنا

کم ہوتا ہے کہ دریا کا کڑاڑا ہے اور سمندر کا ساحل، اِس لیے دُور سے خوب سیر ہو جاتی ہے، ڈُوبنے کا کھٹکا کم ہوتا ہے اور سلامتی کی اُمید زیادہ

بہ دریا در منافع بے شمار است   اگر خواہی سلامت بر کنار ست

لیکن جن اقبال مندوں کی ہمتیں بلند اور طبیعتیں مشکل پسند ہوتی ہیں وہ سلامتی کو آفت سمجھتے ہیں اور آفت کو سلامتی، دریا سے نہیں ڈرتے ساحل پر نہیں ٹھہرتے، خوب جانتے ہیں کہ عَلَیْکُمْ بِلُجَجِ الْبِحَارِ کا ارشاد اسی درجہ ادنیٰ کا پتہ دیتا ہے اور انگشت اشارت اٹھا کر صاف بتاتا ہے کہ درجہ مذکور پر اکتفا بڈھیوں کا دین ہے اور ضعیفوں کا ایمان اِس لیے جان پر کھیل کر ہولناک سمندر میں کود پڑتے ہیں اور گرداب فنا میں چکر کھا کر ڈوب جاتے ہیں کہ دولتِ ابدی ہاتھ آتی ہے اور بقائے سرمدی

ع کاندر فنائے ماست بقائے دوامِ ما

تیسرا درجہ یہ ہے کہ باطن کی صفائی صبحِ صادق کا عالم دکھاتی ہے اور عرفان کا ایک نور دل میں پیدا ہوتا ہے کہ عشق کیلیے

زینہ ہے اور حسن کے لیے آئینہ، اس نور میں چشمِ بصیرت کھل جاتی ہے
اور صاف نظر آتا ہے کہ ہر چیز کا وجود اور وجود کا ایک ایک گل بوٹا
صنعِ بیچوں کی دستکاری ہے اُسی کی فطرت مصوّر ہو کر عدم پر وجود کی
صورت بناتی ہے اور اُسی کی قدرت موقلم ہو کر حسنِ تقدیر کا رنگ
بھرتی ہے کہ اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاہُ بِقَدَرٍ اُس کے سوا کوئی کسی کا خالق
نہیں، وہی سب کا خالق ہے اور سب اُسی کی مخلوق، عَرَض ہو یا جوہر
عقل ہو یا نفس، مادّہ ہو یا صورت، جسم ہو یا روح، فلک ہو یا عنصر
آب ہو یا آتش، باد ہو یا خاک، جماد ہو یا نبات، انسان ہو یا حیوان،
حرکت ہو یا سکون، قول ہو یا فعل، علم ہو یا عمل، غرض اس درجے میں
کھلم کھلا دکھائی دیتا ہے کہ عالمِ ملک ہو یا عالمِ ملکوت، ہر جگہ اُسی کا
راج ہے اور ہر چیز اسی کی محتاج لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ ایک بزرگ
اسی مقام پر آکر فرماتے ہیں مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَأَیْتُ اللہَ فِیْہِ
یہ عارفوں کی توحید ہے اور یہاں ایک نکتہ باریک لائق ذکر ہے اور

قابل توجہ وہ یہ ہے کہ اعتقاد کے معنے ہیں گرہ دنیا، اس لیے اعتقاد کسی شے کا کیوں نہ ہو در اصل ایک گرہ ہے کہ دل میں پڑجاتی ہے، توحید کا اعتقاد اگرچہ ایک لحاظ میں نقطۂ نور یا ستارۂ دیجور ہوتا ہے، لیکن گرہ آخر گرہ ہوتی ہے اس لیے عرفان کا چراغ جب دل میں روشن ہوتا ہے تو اُسکی لَو میں اعتقاد مذکور کی گلجھڑی پھول ہو کر جھڑ جاتی ہے یا پتنگا بن کر اُڑ جاتی ہے اسوقت روشن ضمیری کا نور گرہ کشائی کا زور دکھاتا ہے ناخن کے اشارے میں ایک جہان کی گتھیاں کھل جاتی ہیں اور مشکلات کے بند بند جدا ہو جاتے ہیں۔ اسی درجے میں علم کی منزل طے ہو جاتی ہے اور عین کا مقام آتا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ تقلید عامیانہ اور ہے تحقیق عالمانہ اور ہے اور توحید عارفانہ اور۔ توضیح مطلب کے لیے ایک مثال یہاں لکھتا ہوں:-

دو چار شخص ملکر سیر کے لیے نکلے، رستے میں دور سے ایک ابلق تیز رفتار دیکھا کہ راکب تو گرد و غبار میں دکھائی نہیں دیتا مگر مرکب کے

طراروں میں آسمان پائمال ہو رہا ہے اور سورج بحال، ان لوگوں پر یہ تماشا دیکھ کر حیرت سی چھا گئی اور غفلت کا پردہ پڑ گیا، سمجھے کہ رہوار تو ہے مگر شہسوار نہیں، اس عالم میں ایک رازدار نے خبر دی کہ "نہیں! شہسوار ہے مگر غبار کی آڑ ہے اور نگاہ کابل" یہ بات سن کر صورت حال سب کے دل پر نقش ہو گئی اور یقین کیا کہ سچ کہتا ہے۔ اب ان میں سے ایک نے صرف رازدار کی خبر پر قناعت کی۔ دوسرے نے عقل دوڑائی اور قیاس کیا کہ اگر شہسوار نہ ہوتا تو رہوار کی خوش خرامی کا یہ عالم نہ ہوتا تیسرے نے بھول کر بھی قیاس پر نظر نہیں کی، شوقِ دیدار کے شہپر لگا کر اُڑا اور گرد و غبار کی دیوار چیر کر نزدیک پہنچ گیا، آنکھوں سے شہسوار کی سواری دیکھی کہ اسپِ توسن ران کے تلے دب کر اشاروں پر چلتا ہے اور کوئی قدم بے محل نہیں اُٹھاتا۔"

پہلے اور دوسرے شخص میں علم اور اعتقاد کی رو سے کوئی فرق نہیں ہے، دونوں خوب جانتے ہیں کہ شہسوار گھوڑے پر سوار ہے لیکن

ایک شخص کے اعتقاد کی بنا سماع نقلی ہے اور دوسرے کی قوّتِ بازو
بُرہانِ عقلی، اِس لیے امتیاز کا نشان اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے
کہ یہاں تقلید کا طوق زیور گردن ہے اور وہاں قیاس کا ہار گلے کا ہار
نہیں تو بے نصیبی میں دونو برابر کے شریک ہیں اس نے بھی شہسوار کی
صورت نہیں دیکھی اُس نے بھی دولتِ دیدار نہیں پائی، اس سے معلوم
ہوسکتا ہے کہ یہ دونو تیسرے کی گرد کو نہیں پہنچتے کہ وہ دیکھنے والا ہے
اور یہ دیکھنے والے نہیں ہیں، پہلی صورت ہو تو عامیانہ تقلید کی مثال ہے،
دوسری صورت ہو تو عالمانہ تحقیق کی مثال ہے، تیسری صورت ہو تو
عارفانہ توحید کی مثال۔ اس درجے میں عارف دُوئی کی قید سے آزاد
نہیں ہوتا، امتیاز کے قفس میں بند رہتا ہے قادرِ مختار کو خالق کُل
دیکھتا ہے، ہر چیز میں خدا کی خدائی نظر آتی ہے اور ہر جگہ خالق و مخلوق
میں جدائی، اس لیے ایک لحاظ میں یہاں تفرقہ ہے اور ایک لحاظ میں
جمع، بقائے امتیاز وجہ اوّل ہے اور نورِ عرفان وجہ ثانی۔

چوتھا درجہ - یہ ہے کہ باطن کا نور اور حق کا ظہور سالک پر غالب آتا ہے اور آفتابِ قیامت ہو کر عالم سوزی کی شان دکھاتا ہے کہ وجود کا ایک ایک ذرّہ غبارِ خاک ہو کر ہوا ہو جاتا ہے اور آفتاب ازل کے نور میں ملیا میٹ ہو کر نگاہِ شہود سے اوجھل ہو جاتا ہے اس عالم میں نہ اپنی ہستی پر نظر جاتی ہے نہ غیر کے وجود پر نگاہ پڑتی، صرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے خدا کے سوا کسی کا جلوہ نظر نہیں آتا ع

من و تو رفتیم و خدا ماند

رُباعی

موجود بہ حق واحد اوّل باشد — باقی ہمہ موہوم و مُخَیَّل باشد

ہر چیز جزِ او کہ آید اندر نظرت — نقشِ دُوُمینِ چشمِ احول باشد

یہ کاملوں کی توحید ہے اور اسی مرتبے کو صوفیۂ صافیہ فنا فی التوحید کہتے ہیں، اسی مقام سے وجود و شہود کا اختلاف پیدا ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی مقام سے اختلاف مذکور ناپید ہوتا ہے اور تطبیق کی صورت

بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی حق ہے اور وہ بھی حق۔ اِس کا پہلو اور ہے اور اُس کا پہلو اور۔ ورنہ بشعر

فَکَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلًا صَحِیْحًا ۔ وَاٰفَتُہٗ مِنَ الْفَھْمِ السَّقِیْمِ

یہ ہیں توحید کے چار درجے۔ ان کے بعد ایک اور مقام آتا ہے جہاں بے شرکت مطلق توحید کا نشان ملتا ہے اور فنا سے بھی فنا حاصل ہو جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ اس مرتبے کو فَنَا عَنِ الْفَنَا کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اِستغراق کی شدت ہوتی ہے، اور آفتاب حقیقت کی حدت، اس لیے آگہی شبنم ہو کر ہوا میں اُڑ جاتی ہے، تفرقہ پَٹ جھڑ کی راہ لے کر خاک میں مل جاتا ہے اور سالک اپنی فنا سے بے خبر ہو کر گُم ہو جاتا ہے، جب تک اتنی بے خبری نہیں چھاتی کچھ نہ کچھ تفرقہ باقی رہتا ہے، اس لیے کہ اپنی فنا کا ہوش ایک طرح کی باخبری ہے اور ذرا سی باخبری بھی ہستی کی جان ہے اور تفرقے کی شان، اس لیے کمال کے ماتھے پر نقصان کا داغ کلنک کا ٹیکا ہو کر چمکتا ہے اور جب تک

تفرقۂ ہستی نہیں مٹتا، نقصان کا داغ نہیں جاتا، لیکن تفرقۂ ہستی آسانی سے نہیں مٹتا، جب ہی مٹتا ہے جب رہرو استغراق میں ڈوب کر گم ہوجاتا ہے اور گم ہوجانے سے گم ہو کر نابود۔ (شعر)

إِذَا قُلْتُ مَا أَذْنَبْتُ قَالَتْ مُجِيبَةً
وُجُودُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهِ ذَنْبٌ

یہیں عین الجمع ہے اور یہیں جمع الجمع یہیں مرتبۂ تفرید ہے اور یہی مقام وصل

رَو در رہ گم شو کہ توحید ایں بود ۔۔۔ گم شدن گم کن کہ تفرید ایں بود

بعضے اس طرح پڑھتے ہیں

رَو در رہ گم شو کمال این ست و بس ۔۔۔ گم شدن گم کن وصال ایں ست و بس

اس عالم میں نہ وجود ہے نہ عدم، نہ حدوث ہے نہ قِدم، نہ لوح نہ قلم، نہ عرش ہے نہ فرش، نہ عبارت ہے نہ اشارت، نہ خیر ہے نہ شر نہ دل ہے نہ دلبر۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

چو سلطانِ عزت علم بر کشد

جہاں ہر بحیبِ عدم در کشد

اسی مقام پر کبھی سُبحَانِی مَا اَعظَمَ شَانِی (فافہم) کا نعرہ بلند
ہوتا ہے، کبھی اَنَا الحق کی گونج آویزہ گوشں ہوتی ہے اور گوشوارۂ ہوش
لیکن ۔ ع

ہر آنکو در خدا گم شد خدا نیست

صاف کہتا ہوں اور ایمان کی کہتا ہوں کہ میرا مقام عامیانہ
اعتقاد سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ نکتہ دانِ شریعت نہیں ہوں
رہرو طریقت نہیں ہوں، رمز شناسِ معرفت نہیں ہوں اور آگاہ حقیقت
نہیں۔ ریاکاری کی بھڑک نے اور دنیا پرستی کی بھڑک، حرص کی آگ نے
طوفان بن کر ڈبویا ہے اور ہوا کے فراٹوں نے آندھی ہو کر خاک اڑائی
اب سارا گھر سُونا ہو گیا ہے اور فرشِ خاک بچھونا' اس لیے راگ میرے لیے
رنگ ہے اور رنگ میرے لیے راگ۔ ~

از ہزاراں در یکے گیرد سماع

زانکہ ہر کس محرم پیغام نیست

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سماع کو مطلقاً جائز نہیں سمجھتا یا سماع کی
محفل میں شریک نہیں ہوتا، ہاں ہاں گنہگار ہوں اور مغفرت کا امیدوار ع

درجلۂ عفو با نہانہ شود مستعمل

ایک معمولی سُنّی حنفی ہوں کہ تقلید کی بھنور کلی کمندِ گردن ہے
اور قیود کی پابندی زنجیر قدم، لیکن اس بیچارگی کے عالم میں بھی اتنا
خوب جانتا ہوں کہ صوفیانِ عالی مقام کا حال اور ہے اور اُبْتُلِیْتُ
بِھٰذَا کا محل اور۔

اس لیے راگ اُن کے لیے حلال ہو سکتا ہے کہ وسیلۂ کمال ہے
اور معراج وصال، مگر اس پر بھی اتنا ضرور کہتا ہوں کہ قطبِ ربّانی،
غوثِ صمدانی، محبوبِ سبحانی، حضرت شیخ سید عبد القادر
جیلانی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں
وَالْمُرِیْدُ الصَّادِقُ نَائِرُتُہٗ غَیْرُ خَامِدَۃٍ وَشُعْلَتُہٗ

غَيْرُهَا مِدَارِهٖ وَمَحْبُوبُهُ غَيْرُ غَائِبٍ وَاَنِيسُهُ غَيْرُ مُسْتَوْحِشٍ فَهُوَ اَبَدًا فِيْ زِيَادَةِ دُنُوٍّ وَّقُرْبٍ وَلَذَّةٍ وَّنَعِيْمٍ فَلَا يُغَيِّرُ وَيُهَيِّجُهُ غَيْرُ كَلَامِ مُرَادِهٖ وَحَلَاوَتِهٖ الَّذِيْ هُوَ رَبُّهٗ عَزَّ وَجَلَّ فَفِيْ ذَالِكَ عِنْدَهٗ مَنْدُوْحَةٌ عَنِ الْاَشْعَارِ وَالْقِيَانَةِ وَالْاَصْوَاتِ (الخ) یہی میرا مذہب ہے اور یہی میرا مشرب ہے

کنم با بادہ مستی کہ سودائے دگر دارم
بساقی تلخ می گویم کہ دل جائے دگر دارم

حضرت شیخؒ نے کھلی بات ہے کہ چوٹی کی بات کہی ہے اور اشاروں میں راز پنہاں فاش کیا ہے مگر اشارت اشارت ہے اور عبارت عبارت، اب اگر کچھ اور لکھتا ہوں تو ناکسی اور ناتوانی کا خدا بھلا کرے کہ آئینۂ بیان کتابت کشمیر کا تماشا دکھاتا ہے نہ زبان چلتی ہے نہ قلم، پاؤں لڑکھڑاتے ہیں، ہاتھ تھرتھراتے ہیں عبارت کا

رنگ پھیکا پڑتا ہے اور اشارت کا عکس نہیں اتر سکتا مضمون باریک ہے اور رستہ تاریک، اس لیے زبان خاموش ہے اور دل خود فراموش ورنہ۔ ع

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست

اللہ بس باقی ہوس

خاکسار خاک نشین

محمد جمال الدین عفی عنہ

پروفیسر عربی نظام کالج

مورخہ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ

حضرت کیفی حیدرآبادی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے حسن توجہ پر کافی مذہبی، علمی، اخلاقی کلام چھپ رہا تھا۔
مگر پریس کی بدعنوانیوں کے باعث چارہ کار قانونی اختیار کرنا پڑا۔
قدردانان کلام کے انتظار میں ایک بدکیفی سی ضرور ہو چلی ہے۔
اس لیے حضرت ممدوح کے دیوان (غزلیات، رباعیات وغیرہ) کی ترتیب و تہذیب
عجلت کے ساتھ جاری ہے۔
جو عن قریب (انشاء اللہ تعالےٰ) طبع ہو جائے گا۔

ترقی

ادبی، تاریخی، معاشی، تعلیمی ماہوار رسالہ

اردو کے مسلّم الثبوت انشاپرداز حضرات کی سرپرستی میں (ماہ ربیع الاول شریف ۱۳۴۱ھ سے)
نہایت آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے اور جس نے اپنی ابتدائی منازل ہی میں
مقبولیت عامہ کا خلعت حاصل کر لیا، لکھائی، چھپائی، دیدہ زیب، کاغذ چکنا
عمدہ، ان خوبیوں کے باوجود قیمت صرف پانچ روپیہ مع محصول۔

حیدرآباد دکن، دفتر رسالہ ترقی، اندرون دروازہ چادرگھاٹ